قرۃ العین چنا
ریسرچ اسکالر ایم فل، شعبۂ اُردو،
جامعہ کراچی

ترقی پسند تحریک: اردو اور سندھی افسانہ؛ ایک تقابلی جائزہ

ABSTRACT

Progressive movement: Urdu and Sindhi Short Story: A comparative analysis.
By: Qurat ul Ain Channa, Reserch Scholar M.Phil, Department of Urdu, University of Karachi.

Sub-continent`s many languages have taken much impact from other genres of foreign languages and in them Urdu remains at the top .Urdu short story has become the most popular genre while it was adapted by many other languages of sub-continent as well. Sindhi short story has taken much effect from Urdu while it becomes more extensive in some cases. It has also provided some new dimensions to Urdu short story. In this article, the researcher traces down the impacts of Urdu short story on Sindhi short story with reference to a major literary movement, which is often termed as Progressive movement.

جولائی ۱۹۳۵ء پیرس میں World Congress of Writers for the Defence of Cutures کے نام سے اجتماع ہوا۔ جس میں مکسم گورکی، رومین رولاں، ٹامس مان اور آندرے مارلو جیسی شہرہ آفاق شخصیات نے شرکت کی۔ سجاد ظہیر بھی اس کانفرنس میں بطور مشاہد موجود تھے (۱)۔ سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے اجتماع میں شریک ان نامور شخصیات کے خیالات سے شدید متاثر ہو کر ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس کا مقصد انڈین پروگریسو رائٹیر ایسوسی ایشن کو منظم کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مختصر منشور بھی تشکیل دیا گیا اور بعد میں ہندوستان کے ادیبوں کو بھیجا گیا۔ جس کا نتیجہ بلاخر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے قیام کی صورت برآمد ہوا۔ اس تحریک نے نا صرف اپنے عہد کے تمام بڑے ادباء و شعراء کو متاثر کیا بلکہ ادب کے تمام شعبوں پر اپنے اثرات بھی مرتب کیے مگر جو اصناف بالخصوص ترقی پسند خیالات سے متاثر ہوئیں ان میں افسانہ، تنقید اور شاعری شامل ہیں۔

نو آبادیاتی محکومی کے علاوہ ہندوستانی معاشرے پر جن دیگر مسائل کا گہرا سایہ تھا۔ وہ انسانی حقوق، بھوک، غربت، طبقاتی کشمکش اور غیر مساویانہ ماحول تھا۔ لہذا طبقاتی تفاوت کے اس معاشرے میں نا صرف ترقی پسند تحریک کو

بلکہ کارل مارکس کے فلسفہ کو بھی پذیرائی حاصل ہونے لگی۔ کارل مارکس نے جو کمیونسٹ مینی فیسٹو (اشترا کی منشور) وضع کیا تھا۔ اس کے مطابق '' دنیا کا بنیادی جوہر مادہ ہے۔'' مارکس فلسفے کی فکری اساس ہی یہی ہے کہ مادی ذرائع ہی زندگی کی بنیادی ضروریات ہیں۔

'' مارکس کا اقتصادی تجزیہ (Economic Analysis) بہت اہم ہے جو ریکارڈو (Recordo) کے اصول کی توضیع ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز کی قیمت کا اندازہ اس میں صرف کی ہوئی محنت کی روشنی میں لگانا چاہئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مالک کی اصل چیز کی قیمت نکل آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مزدوروں کو ان کی محنت کا ثمر بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جو ان کی بیوی بچوں کے کام آتا ہے۔ مارکس نے اس اصول کا نام قدر زائد Surplus Value)) رکھا ہے اس کا قول ہے کہ فیکٹریوں اور ملوں میں مالک اصل چیز کی قیمت نکالنے کے بعد بھی مزدوروں سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح مزدور تناسب سے زیادہ کام کرتا ہے۔ مگر اس کو فائدہ محنت کے لحاظ سے کم پہنچتا ہے۔ مارکس کے اس نظریئے نے اس کو عالمی شہرت کا مالک بنا دیا۔ چوں کہ اس دور میں مزدوروں اور مالکوں میں تنازع شروع ہو گیا تھا (۲)۔''

ایک خالص ادیب اپنے عصر کی سچائیوں کا امین ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو اس تحریک کے تحت لکھنے والوں نے بحیثیت مجموعی ارضیت کے شعلوں کو تخلیقی روشنیوں سے گزار کر پیش کرنے کی سعی کی۔ ہر چند کہ ادبی تخلیقات پر نعرے بازی، پروپیگنڈہ سازی اور بنے بنائے اصولوں کے تحت تخلیق ہونے کے الزامات بھی عائد ہوئے جو کسی حد تک ٹھیک بھی تھے۔ پر حقیقت یہ ہے کی پہلی مرتبہ ترقی پسند تحریک کے ذریعے ہی انسانی زندگی کے ہمہ جہت پہلو افسانے کے موضوعات بنے۔

مذکورہ مضمون بعنوان اردو اور سندھی افسانے پر ترقی پسند تحریک اور اس کے اثرات کے جائزے میں تقابل کی اہم ذمہ داری کے عائد ہونے کی شرط ادبی اظہار کے بہت سے زاویوں پر روشنی ڈالنے کا تقاضا کر رہی ہے۔ اگر اس جائزے کی شروعات دونوں زبانوں میں افسانے کے ارتقاء و زمانی حدود کی پرکھ سے کی جائے تو اس مقام پر اردو کو سبقت حاصل ہوتی ہے۔ اردو میں افسانوی ادب کی شروعات عام معنوں میں انیسویں صدی کے فوراً بعد اور ترقی پسندی کا آغاز ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس منقعد لکھنوء کے بعد سے ہوتی ہے۔

سندھی افسانوی تاریخ کی ابتداء ۱۹۱۴ء میں لعل چند امرڈنو کی کہانی ''حرمکئی جا'' سے ہوئی۔ اور یہ کہانی سندھی ساہتہ کے رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ اس پہلی سندھی کہانی کے بعد اگلی پوری ایک دہائی تک وقتاً فوقتاً شریمتی گھوشال،

بھیرومل ہرچند، دیوان بول چند دیا رام اور نرمل داس فتح چند کی کہانیاں سندھی ساہتہ میں شائع ہوتی رہیں (۳)۔ یہ سندھی افسانے کا بالکل ابتدائی دور ہے اس عہد کے اہم رجحانات کے حوالے سے مظہر جمیل لکھتے ہیں:

''سندھی افسانے کا ابتدائی دور ترجمے کے بعد تاریخی اور اخلاقی کہانیوں کا دور تھا۔ جس میں سماجی مسائل بھی اٹھائے جاتے تھے لیکن اصلاحی مقصد بھی پیش نظر رہتا تھا (۴)۔''

انیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں اردو افسانے پر بھی رومانویت، اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری کے رجحان غالب رہے۔ ان رجحانات کا اثر اردو افسانے کے اولین دور کے لکھنے والے افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی اور حیات اللہ انصاری کے افسانوی فن پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا افسانوی تخلیق کے باب میں سماجی حقیقت نگاری کی جڑیں زندگی کے اخلاقی و اصلاحی پہلوؤں میں پیوست رہی ہیں۔

سندھی افسانہ بھی اپنے ابتدائی عہد سے ہی سماجی و اخلاقی مسائل کا عکاس رہا ہے۔ اور اسی رجحان کے تحت بعد میں سندھی افسانے نے سماجی حقیقت نگاری کی طرف رجوع کیا۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اردو افسانوی ادب میں دو افسانوی مجموعے ''انگارے'' و ''شعلے'' کے نام سے منظر عام پر آ چکے تھے۔ ان دو مجموعوں کے ساتھ، اردو افسانے میں با اعتبار موضوع، مواد، تکنیک و زاویہ نظر ایک انقلاب آفریں عہد کا آغاز ہوا۔ رشید جہاں، احمد علی، محمود الظفر اور سجاد ظہیر کے باغیانہ لہجے کی گونج ترقی پسند دور کے شروع ہونے کے بعد بھی جاری رہی۔

سندھی ادب کا پہلا ترقی پسند افسانوی مجموعہ ''سرد آھوں'' (سرد آہیں) ۱۹۴۲ء میں ''نئیں دنیا کتاب گھر'' شکار پور سے شائع ہوا (۵)۔ اس کے مصنف گوبند پنجابی تھے۔ اس مجموعے کی تمام کہانیوں میں غریب عوام، مزدور طبقے، کسانوں کے مسائل، سرمایہ داروں، زمیں داروں کے مظالم طبقاتی کشمکش اور سیاسی شعور کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جو کہ سندھی افسانے میں حقیقت نگاری کی اطلاع دے رہی ہیں۔ ''سرد آھوں'' کے افسانے موضوعاتی نوعیت سے تو نئے تھے ہی پر فنی رموز و علائم سے یہ افسانے فنی محاسن کے رنگوں میں ابھی کچے اور پھیکے تھے۔

سندھی میں سماجی حقیقت نگاری کا دور امر لال ہنگورانی کے رسالے ''پھلواری'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس رسالے کی شروعات ۱۹۳۰ء سے ہوئی۔ خود امر لال ہنگورانی نے ۱۹۴۰ء میں دھماکہ خیز کہانی ''ادو عبدالرحمان'' لکھی۔ اس کہانی کا شمار اپنے عہد کی شکار کہانیوں میں ہوتا ہے (۶)۔ پر سندھی کی جس کہانی نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شیخ ایاز کی ''سفید وحشی'' ہے۔ اس افسانوی مجموعے کی اشاعت ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ دراصل دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی معاشرہ جس تیز رفتار عمل کے ساتھ تبدیلیوں سے گذر رہا تھا۔ اس کے اثرات سندھی معاشرت و ادب پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ آزادی کی جدوجہد اور برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کی گونج

اب سندھی ادب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ سندھی ادب میں ''سفید وحشی'' پہلا افسانوی مجموعہ تھا۔ جسے باغیانہ رویے کا غماز ٹھہرا کر ضبط کر لیا گیا (۷)۔

اردو افسانہ ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ تخلیق ہو کر اردو کی افسانوی تاریخ کو رشید جہاں، احمد علی، پریم چند، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے نام دے کر افسانے کی ایک تاریخ رقم کر چکا تھا۔ موضوعی اعتبار سے ان کے افسانے سیاست و معاشرت سے جڑے ہوئے تھے۔ سیاسی و سماجی مسائل کے علاوہ سماجی حقیقت نگاری کے جس خاص جزو پر ترقی پسند افسانہ نگاروں نے توجہ دی وہ جنسی حقیقت نگاری ہے۔ منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی اور عزیز احمد جنسی حقیقت نگار ہیں۔ دیوندر ستیارتھی نے بھی جنسی و نفسیاتی الجھنوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اور بطور خاص عورت کی پیکر تراشی میں انھوں نے خاص دلچسپی لی۔ موضوعات و پیش کش کے حوالے سے چند افسانوں کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

> ''فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔ باب۔۔ باب۔۔ باب۔۔ فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا''

(آخری کوشش۔۔۔ حیات اللہ انصاری) (۸)

> ''کیسا برا رواج ہے۔ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چھیتڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن ملے۔''

(کفن۔۔۔ پریم چند) (۹)

> ''اچھا یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟ ہم نے دوسرا سوال پوچھا ''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں''۔۔۔ وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پہ گننے لگتا ہے۔۔۔ ''چار روپے کا آٹا لاتا ہوں۔۔۔ ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ کتنے روپے ہو گئے چھوٹے صاحب؟''
>
> ''سات روپے''

''ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنیئے کو دیتا ہوں، اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے کرج لیتا ہوں ناں۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے۔۔۔''وہ کیسے''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور مکئی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے''

(کالو بھنگی۔۔۔۔کرشن چندر)(۱۰)

''لیکن مجھے تو تجھ سے خوف معلوم ہوتا ہے''۔''کیوں؟''

مرد نے اجڈ پن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔ لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔

''تم ہنستے کیوں نہیں؟''

''ارے یہ بات؟'' یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوف ناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے، اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

(جگا۔۔۔۔بلونت سنگھ)(۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات بھوک، غربت، کم مائیگی، کم حیثیت اور معاشی پس ماندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانہ ''آخری کوشش'' عبارت در عبارت ساری گہرائی، ساری معنویت اور فکر و خیال افسانہ نگار کی مشاہداتی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' کا مرکزی خیال غربت و افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حسی اور بے ضمیری کو عیاں کرتا ہے۔ جب استحصال اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو معاشرے میں طبقہ وارانہ نظام تشکیل پانے لگتا ہے۔ اور یہی نظام چھوٹے طبقوں میں مادھو اور گھیسو جیسے لوگوں کو جنم دیتا ہے۔ جو بھوک اور پسماندگی کے باعث انسانی خوبیوں سے عاری ہو کر بے حس بن بیٹھتے ہیں۔ کرشن چندر کا افسانہ ''کالو بھنگی'' ایک سیدھا سادہ افسانہ ہے۔ جس میں ایک بھنگی کے معمولات زندگی کے چند واقعات کو ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ مگر در حقیقت یہ واقعات معاشی ناہمواریوں اور سماجی قوانین پر سوچنے کے لیے پڑھنے والوں کے اذہان پر بے طرح خیالات جھونکتے ہیں۔ اردو کے ایک اور افسانہ نگار بلونت سنگھ نے بھی دیہات نگاری کو اپنے تخلیقی اظہار کے لیے چنا۔ انھوں نے عام جفاکش دیہاتیوں کے کردار پیش کیے۔ ان کے افسانوی بیانیے کی سادگی میں گہرے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جنسی

حوالے سے منٹو کا نام اہم ہے۔ منٹو جنس، شہوانیت، ظلم و ایذاء دہی اور شدید ہیجانی جذبات سے مغلوب غیر معمولی و اقعات سے چونکا دینے والے افسانوں کا تخلیق کار ہے۔ ممتاز شیریں نے اسے موپاساں کی طرز کا افسانہ نگار کہا ہے۔ (۱۲) منٹو کے مقابلے میں عصمت کا لب ولہجہ زیادہ کاٹ دار اور بے باک ہے۔ وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر روانی میں رینگتے، پھسلتے اور ڈنک مارتے اسلوب کے ساتھ پڑھنے والوں کے اندر کھلبلی مچاتی رہیں۔ ہم جنسیت کے موضوع پر ان کے مشہور عہد ساز افسانے ''لحاف'' کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ ہاتھی پھڑ پھڑا رہا تھا ،اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔''

(لحاف۔۔۔عصمت چغتائی) (۱۳)

جنس نگاری کے سلسلے میں آغا بابر کا نام لینا بھی لازم ہو جاتا ہے جنس پر لکھنا انھیں مرغوب تھا۔ سماجی حقیقت نگاری کے تناظر میں سدرشن، مہندر ناتھ، بیدی اور اوپندر ناتھ اشک کے افسانے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اشک ترقی پسندانہ نکتہ ءنظر رکھتے تھے۔ سماج کے نچلے طبقے کے مسائل اور حالات زندگی کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ملکی سیاست کو بھی پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں وطن سے محبت اور معاشرے کے نچلے طبقے سے خاص ہمدردی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

''کاکا رام دین۔ میں یہاں کیوں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے وہاں چٹائی پر کیوں بیٹھنا پڑتا ہے؟''

''اس لیے کہ تو اچھوت ہے'' رام دین نے جواب دیا۔ منگو کو اچھوت کے معنی نہیں معلوم تھے۔ مگر اسے یہ لفظ سنتے ہی اپنے آپ میں سے ایسی گھناؤنی بو آئی کہ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ کر برآمدے میں جا بیٹھا''

(ٹیری لین کی پتلون۔۔۔خواجہ احمد عباس) (۱۴)

موضوعاتی سطح پر سہیل عظیم آبادی اور انور عظیم کا شمار بھی سماجی حقیقت نگاروں میں لیا جا سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر دیہات کے مصور ہیں، مگر ان کے طرز نگارش میں کہیں کہیں ادبی و شاعرانہ رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ وقار عظیم نے ایک جگہ لکھا ہے، ''ادبی اور شاعرانہ رجحان کا اظہار کبھی تضاد کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی طنز کی شکل میں (۱۵)۔'' پس معصوم، الہڑ پن و سادگی کے ساتھ ساتھ جہاں بے رحم حقیقت نگاری کی ضرورت پیش آئی وہاں قاسمی

کے اظہار نے شدت پیدا کرنے کے لیے گہرے طنز و سفاکانہ سرد مہری سے کام لیا۔ افسانے ''کنجری'' کی چند سطروں کی جھلک دیکھیے۔

''ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ ''کل پھر ملیں گے میری جان''
اور آخر کمالاں بولی۔ ''کل تو خیر ملیں گے، پر آج کی اجرت کہاں ہے؟''
''اجرت'' ابراہیم غصے سے بولا۔۔۔ ''اجرت مانگتی ہے؟ عاشق کی اجرت مانگتی ہے؟ شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے ناں کنجری''

(کنجری۔۔۔ احمد ندیم قاسمی) (۱۶)

ایک ادیب کے خیالات جذبات اور احساسات اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور ان احساسات و خارجی عوامل کا انسانی ذہن و دل پر بڑا اثر ہوتا ہے جس کا نتیجہ ادبی تخلیقات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ طبقاتی کشمکش و سماجی تضاد سے ابھرتے رشتے ناطوں میں الجھے کرداروں کی تعمیر ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ جبکہ ان کی بہن خدیجہ مستور نے سیاسی چالبازیوں سے نفرت، جنسی گھٹن اور طبقاتی تقسیم جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں کشادہ کیا۔ ہنڈ پمپ، دس نمبری اور تلاش گمشدہ ان کی قابل قدر تخلیقات ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے ادب میں جس حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی وہ مارکس و اشتراکی خیالات پر استوار ہے۔ ان خیالات کے مطابق ادب اور زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جبکہ انسانی زندگی کا رشتہ براہ راست قومی تہذیب، ملک کی معیشیت و اقتصادی نظام سے جڑا ہوا ہے۔ سندھی افسانے کے موضوعاتی جائزے سے قبل اس امر کو سمجھنا لازم ہے کہ سندھی ادب میں ترقی پسندی کا باقاعدہ آغاز کب اور کیسے عمل میں آیا۔

سندھی ادب کی قد آور شخصیات و نقادوں نے ترقی پسندی کو ایک رجحان تصور کر کے سندھ کے قدیم ادبی صنفوں میں اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں سبط حسن کے خیالات اہم ہیں۔ جنھوں نے شاہ عنایت کو سندھ کا پہلا سوشلسٹ قرار دیا۔ (۱۷) جب کہ ڈاکٹر غفور میمن اپنے تحقیقی مقالے میں سچل سرمست کو صوفیانہ نقطہ نظر کی بنا پر ترقی پسند فکر کا نمائندہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ سچل سرمست کی شاعری میں تعصب و شدت پسندانہ رویوں کی مخالفت ملتی ہے (۱۸)۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری بھی سندھی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے سندھی معاشرے کے مجبور و مظلوم کرداروں سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک بھی بنیادی طور پر انسان کی تہذیبی، تاریخی، عوامی فلاح و بہبود اور انسان کی انسانی حیثیت کی توسیع و فروغ پر زور دیتی ہے۔ (۱۹) سندھ کے قدیم صوفی مزاج اور فن پاروں میں انسان دوستی و انسانیت پرستی کے جذبات کا اظہار تو بلاشبہ ملتا ہی ہے پر ارضی

حیثیت میں اس کی بنیاد اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے بعد پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں منظور علی ویسریو اپنی کتاب کے پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہیں۔

> ''۱۹۳۴ء میں سندھی اور اردو ادیبوں نے مل کر کراچی میں ایک ادبی سرکل قائم کیا۔ جو آگے چل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی صورت میں پروان چڑھا۔ سندھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد سندھ کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اس رجحان کو بھرپور طریقہ سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا (۲۰)۔''

ترقی پسندی کے حوالے سے ۱۹۴۲ء میں برکت علی آزاد نے ماہنامہ سندھو کے شمارہ اپریل میں ''ادب آئین زندگی'' (ادب اور زندگی) کے عنوان سے ایک نظریاتی مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں زندگی اور سماج کے ساتھ ادب و ادبی تخلیقات کا رشتے کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔ (۲۱) ۱۹۴۳ء میں ترقی پسند تحریک کی پہلی ادبی تنظیم کی بنیاد کا اتباع ''سندھ ادبی سرکل'' کے نام سے ڈی جے سائنس کالج کراچی میں شیخ عبدالرزاق اور ان کے چند دیگر ترقی پسند ادیبوں کے ذریعے ہوا۔

> ''سندھی ادب میں ترقی پسند ادب تخلیق ہونے کا آغاز ہوا۔ اور سندھی میں صحت مند ادب تخلیق ہونے لگا۔ سرکل کی جانب سے جو بھی ادبی نشستیں منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں شعراء کے پیش کردہ کلام پر ناقدین کی جانب سے تنقید کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ افسانے، مضامین یا کوئی بھی ادبی تحریر پیش ہوتی تھی تو اس پر تنقید ہوتی تھی۔ اور ان کو بہتر سے بہتر بنانے اور ان میں زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل کو پیش کرنے پر زور دیا جاتا تھا (۲۲)۔''

یہ اہم بیان اس بات کا عکاس ہے۔ جس کا اشارہ مضمون کی ابتداء میں دونوں زبانوں میں افسانے کی ارتقاء و زمانی حدود کی پرکھ کے ذریعے کیا گیا تھا۔ یعنی سندھ افسانے میں ترقی پسندی کے اثرات بہت بعد میں رونما ہونا شروع ہوئے۔ مزید برآں یہ کہ ۱۹۴۳ء میں جب ''سندھ ادبی سرکل' کی بنیاد پڑنے کے بعد سندھی افسانے و دیگر اصناف میں ترقی پسندی کے تحت زندگی اور اس کے مسائل کے پرچار کی شروعات ہوئی۔ جبکہ اس وقت تک اردو افسانہ تخلیقی سطح پر موضوعات کی پیش کش میں بلند و بانگ مقام حاصل کر چکا تھا۔ افسانے میں ترقی پسندی و روشن خیالی کے اظہار کی طرف مڑتے ہوئے سندھی کے چند معتبر ترقی پسند افسانہ نگاروں کے نام لینا ضروری ہے۔

شیخ عبدالرزاق راز، شیخ ایاز، سوبھو گیان چندانی، جمال ابڑو، ایاز قادری، غلام ربانی آگرو، شیخ حفیظ، ابن

حیات پنہور، بشیر موریانی، رشید بھٹی، حمید سندھی، نسیم کھرل، ڈاکٹر نجم عباسی، سراج الحق میمن، امر جلیل، غلام نبی مغل، طارق اشرف، علی بابا، رسول بخش پلیجو، منیر احمد مانک، آغا سلیم، ماہتاب محبوب، رشیدہ حجاب، خیر النساء جعفری، نور الہدیٰ شاہ اور بہت سے دیگر نام جنھوں نے سیاسی، سماجی، جنسی اور نفسیاتی موضوعات پر افسانے تحریر کیے۔ ہر چند کے مضمون میں اختصار کی شرط کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذکورہ بالا تمام افسانہ نگاروں کا فنی جائزہ تو قابل ممکن نہیں ہے تاہم چند اہم ناموں کے فن، تخلیق اور موضوعات کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

قیام پاکستان کے فوری بعد سامنے آنے والے ادبی ناموں میں شیخ عبدالرزاق اور شیخ ایاز نمایاں ہیں۔ شیخ ایاز نسبتاً ادبی حلقے میں قیام پاکستان سے پہلے ہی اپنی ادبی پہچان رکھتے تھے۔ ان کے افسانے ''نوراں''، ''دھلنی'' (ہنسوڑ)، ''کارورنگ'' (کالا رنگ) اور ''سفید وحشی'' سیاسی و نیم سیاسی کشمکش اور خالص سندھی معاشرے کے آئینہ دار ہیں۔ شیخ ایاز کے افسانے عصری ہم آہنگی کی بنا پر منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی اپنے وسیع تناظر میں نظر آتی ہے۔ شیخ ایاز کے بعد سوبھو گیان چندانی اور جمال ابڑو نے سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔ ہر چند کہ جمال ابڑو نے بہت کم لکھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے جتنا بھی لکھا وہ سندھی افسانے میں ایک تاریخ رقم کر گیا۔ شیخ ایاز اس خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> ''روسی ادیب اساک بیبل نے بھی جمال ابڑو کی طرح ایک ہی کتاب ''سرخ رسالہ'' لکھی تھی۔ جس پر اسٹالن نے اسے قتل کروا دیا۔ پر اس کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا میں امر ہو گیا۔ جمال بھی سندھی ادب میں امر ہو گئے ہیں (۲۳)۔''

سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو ایاز قادری، طارق اشرف، رشید بھٹی، منیر احمد مانک اور آغا سلیم نے آگے بڑھایا۔ ایاز قادری اور رشید بھٹی نے سندھی ادب کو بڑے افسانے دیئے۔ دونوں کے افسانوں کا فکری محور انسانیت ہے۔ سندھی افسانے میں ایاز قادری کی پہچان ان کے افسانے ''بلو دادا'' سے ہوتی ہے۔ پر میرے مطالعے کے مطابق ان کا افسانہ ''کتے کی موت'' انسانی سماج میں انسانی تشخص کی جو دھجیاں اڑاتا ہے اس پر آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ افسانہ ''کتے کی موت'' سندھی گاؤں کے ایک وڈیرے کی نسلی بے حسی کو آشکار کرتا ہے۔ جس میں ایک وڈیرہ اپنے بیمار نوکر پر پالتو کتے کو ترجیح دیتا ہے۔ گلو جسے دوا کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ وڈیرے کی بے حسی کے باعث آخر کار تڑپ کر مر جاتا ہے اور وڈیرا اس کی پرواہ کیے بغیر کتے کو جانوروں کے اسپتال دکھانے کے لیے کار میں لے کر شہر کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ سندھی ترقی پسند افسانے کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ماما پئسو ڈی''

شاہ کی جن تہ تھا بوا چی ویو۔ بانھون لوڈیا ئین، متھو لوڈیا ئین۔

کندھا جان بہ متھ بھروکیا ئین ''ماما''

کتی جی دھی۔۔۔۔امتی تھی اہلبیت کھی ماموکری؟

(شاہ جو پھر۔۔۔۔جمال ابڑو)(۲۴)

''امان مون کی بک لگی آ''

دس پٹ!اج چند کتھے نکتو آھی؟ پان غریب آھیون بُھجی مانی جو حساب چندوانگی آھی

رکوھن ادھ، کدھن سجی نہ کدھن آھی ئی کونہ۔مون اونداھی آسمان ڈانھن نھاریوءِ ماءُ

جی کچھ مۂ اگھورنند میں پئجی ویس(۲۵)۔

جمال ابڑو کا نام بھی سماجی حقیقت نگاروں میں لیا جاتا ہے۔ان کے افسانوی مجموعے ''پشو پاشہ'' کے تمام افسانے طبقاتی تضاد اور سماجی کجروی کے مظہر ہیں۔ان کا ایک افسانہ ''بدتمیز'' سماجی کشمکش کا آئینہ دار ہے۔اس افسانے کا اہم کردار ایک ڈاکٹر ہے۔جو کہ فیس نہ ہونے کے سبب ایک غریب کا علاج نہیں کرتا۔جبکہ اپنے ایک دوست کا مفت علاج کر کے اس سے یہ کہہ کر پیسے نہیں لیتا کہ ''میں اتنا بدتمیز تھوڑی ہوں''۔جمال ابڑو کا یہ افسانہ ایک طرف مسیحائی کے پیشے پر کڑی تنقید کرتا ہے تو دوسری طرف مفاد پرستی اور معاشی حیثیت میں انسانی بھید بھاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ان کے دیگر افسانوں میں ''مان مرد'' (میں مرد)، ''پیرانی''، ''شاہ جو پھر'' (شاہ کا بیٹا) اور ''خمیسے جو کوٹ'' (خمیسے کا کوٹ) اہم ہیں۔ان کا افسانہ ''لاری'' ایک خستہ حال لاری کے سفر کو بیان کرتا ہے۔اس افسانے میں ہلکے پھلکے جملوں کے ذریعے قانون کے رکھوالوں، سرکاری دفتروں اور اہلکاروں کی کارستانیوں پر طنز کیا گیا ہے۔ابن حیات پنہور اور شیخ حفیظ کے افسانوں پر بھی ترقی پسندی کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ابن حیات پنہور کے ہاں شعوری بیداری کے موضوعات ملتے ہیں۔شیخ حفیظ کا ایک افسانہ ''اماں مان اسکول نہ ویندس'' (امی میں اسکول نہیں جاؤنگا) ایک غریب دیہاتی بچے کی کہانی پیش کرتا ہے۔جس سے اسکول جانے کے علاوہ بھی بہت سے کام کروائے جاتے ہیں۔دوسری طرف اسکول میں معلم کا رویہ علمی نہیں بلکہ جاہلانہ ہوتا ہے۔بچے کو مارا پیٹا جاتا ہے۔جس کے باعث بچہ اسکول سے بےزار ہو جاتا ہے۔حفیظ کے دیگر افسانوں میں ''فقیر رمندا رھن تھا'' (فقیر چلتے رہتے ہیں) ''بہ لڑک'' (دو آنسو) ''مبارکوں'' (مبارکیں) اور ''ساگر جی لہرونتے'' (ساگر کی لہروں پر) معروف ہیں۔

جاگیرداروں کی حاکمانہ سوچ اور کٹھور رویوں کا اظہار کم و بیش تمام سندھی ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔حمید سندھی نسیم کھرل، ڈاکٹر نجم عباسی اور امر جلیل جیسے بڑے افسانہ نگاروں نے طبقاتی کشمکش و طبقاتی تضاد پر مشتمل ایسی بہت سی کہانیاں لکھیں جو وڈیرہ شاہی ظلمت و حاکم پرستی کے گرد گھومتی ہیں۔

سندھ کا معاشرہ اپنے قدیم دور سے ہی جہالت کے اندھیروں میں کھویا ہوا تھا۔ ذات پرستی، پیر پرستی، قبر پرستی، فرقہ پرستی، مذہبی تنگ نظری، جاگیرداروں کی غلامی اور ھاریوں (کسانوں) کے ساتھ ناانصافی سندھی سماج کا عمومی مزاج رہا ہے۔ ڈاکٹر نجم عباسی نے پیر جولون (پیر کا نمک) اور چھوڈو (چھال) لکھ کر معاشرے میں پھیلے ہوئے پیر و مرشد کی کرامات و اندھے اعتقادات کے خلاف کھلا احتجاج کیا ہے۔ سندھی ادب کے ایک دوسرے افسانہ نگار نسیم احمد کھرل نے بھی بڑے فنکارانہ انداز میں طنز نگاری سے سماج میں موجود برائیوں و طبقاتی خرابیوں، جاگیرداروں کے غیر منصفانہ رویوں اور نئی شہری زندگی کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ صنعتی تہذیب کے سلسلے میں نسیم کے دو افسانے ''کرنٹ'' اور ''مکسڈ گرل'' نمایاں ہیں۔ تاج بلوچ نے ان کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ (ترجمہ):

> ''نسیم احمد کھرل اپنے عہد کے ہی نہیں بلکہ آنے والے تمام ادوار کے افسانہ نگار رہیں گے۔ ان کی حیثیت و قامت کی کوئی مثال نہیں۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے غیر جمہوری رویوں اور ریاستی جبر کے خلاف اعلان جنگ کیا (۲۶)۔''

امر جلیل کی افسانہ نگاری پر بھی ترقی پسندی و روشن خیالی کے اثرات ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے سلگتے مسائل (جن کا تعلق سیاست، معیشیت، معاشرت اور ریاستی جبر سے تھا) کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انسان کی مفلوک الحالی، عذاب اور امیدیں امر جلیل کے افسانوں کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ امر کی کہانی ''مرنے سے پہلے مرنے کے بعد'' اونچے اور نچلے طبقے کے فرق کو ظاہر کرتی ہوئی کہانی ہے۔ اس کہانی میں ایک میرے ہوئے انسان کو دفنانے کی تیاریاں دکھائی گئی ہیں۔ اس موقع پر جب جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوتا ہے اور لوگ مرنے والے کے لیے مختلف آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ کوئی مرنے والے کی اچھائیوں کو ظاہر کرتا ہے تو کوئی اُس کی برائیوں کو۔

جنازے کے ساتھ مرحوم کا فرزند بھی سر جھکائے بڑی نفاست کے ساتھ آہستہ قدموں سے قبرستان کی طرف روانہ ہے۔ اس کے ہاتھوں میں رومال ہے جس میں امونیا اور یوکلپٹس کے تیل کے چند قطرے چھڑکے ہوئے تھے۔ یہ رومال جب بھی اُس کے پپوٹوں کو چھوتا دھڑ دھڑ آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں ٹپک پڑتیں۔ اسی اثنا ایک فقیر آگے بڑھ کر اُس نوجوان سے لجاجت بھری التجا کرتا ہے:

> ''سائیں مرحوم کا ایک کپڑوں کا جوڑا مجھے دے دو۔ محتاج ہوں۔ نہیں سب کپڑے مولوی صاحب کو دیئے جائیں گے۔ مولوی صاحب کے پاس پہلے ہی بہت سے کپڑے ہیں۔ کل بھی ایک میت کے کپڑے ملے ہیں۔ اتنے سارے کپڑوں کا وہ کیا کرے گا۔ خوامخواہ بیچ ڈالے گا۔ بکواس بند کرو۔ نوجوان نے اُسے جھڑک دیا۔

اچھا آپ ناراض مت ہوں۔ دُعا والا کھانا لینے آجاؤں؟

کھانا شاہ صاحب کے گھر جائے گا۔

شاہ صاحب کے پاس تو ویسے ہی کھانے کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ خوامخواہ کتوں کو کھلا دے گا۔ کھانا مجھے دے دیں۔

میرے بچے بھوکے ہیں۔

بھوکے ہیں تو کیا کروں۔ ان کی حیثیت سیدوں سے بڑھ کر تھوڑی ہے (۲۷)۔''

جنسی حقیقت نگاری میں غلام نبی مغل منفرد و بے باک طرز نگارش رکھتے ہیں۔ ''ریشمی وار'' (ریشمی بال)، ''اوندا ہار ستا'' (اندھیرے راستے) ''شیشے جو گھر'' (شیشے کا گھر)، ''واچوڑن میں لاٹ'' (بگولوں میں روشنی) ان کے اہم اور نمائندہ افسانے ہیں۔ موضوعاتی سطح پر طارق اشرف، شوکت شورو اور حمید سندھی کے افسانوں کے موضوعات حقیقت نگاری پر مشتمل ہیں۔ سندھ کی خواتین افسانہ نگار جن کے افسانوں پر ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان میں ثمرہ زریں، رشیدہ حجاب، ماہتاب محبوب، خیر النساء جعفری، بیگم زینت چنہ اور نور الہدیٰ شاہ ہیں۔ ان کے ہاں انسان کی سماجی زندگی کی پیکار، رسموں رواجوں اور عقائد کے مسائل اور عام انسان کے دکھ سکھ کی داستانیں ملتی ہیں۔

ماحصل:

سندھ کے ثقافتی و سماجی منظر نامے پر شروع سے ہی جاگیردار طبقہ مسلط رہا ہے۔ سندھ کا عام انسان اپنی زمینی اور زمانی حالتوں میں مقتدر حاکم کا مرہون رہا ہے۔ جس سے ہمیشہ سماجی وفکری تضاد جنم لیتا رہا ہے۔ چنانچہ مارکسی نظریئے کی قبولیت اور ترقی پسندی کی پذیرائی کے لیے سندھی ادب میں راہ ہموار تھی۔ زیر نظر جائزے میں سندھی افسانوں کے موضوعات انسانی دکھ، مظلومیت، غربت، بیماری، بھوک، افلاس، قومیت اور سندھ کی معاشی پسماندگی کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ سندھی افسانے کی طرح اردو افسانوں میں بھی کم و بیش ان ہی مسائل کو موضوع کیا گیا ہے۔ پر فرق چار دیواری اور آفاقیت کا ہے یعنی سندھی افسانوں کے موضوعات اپنی زمین و قومیت سے جڑے ہوئے ہیں۔ جبکہ اردو افسانے نے ہندستان کی پوری قوموں، تہذیبوں و ثقافتوں، اور مذاہب سے مواد حاصل کیا ہے۔ کرداروں کی پیش کش میں بھی اردو ترقی پسند افسانہ متمول و متنوع نظر آتا ہے۔ جبکہ سندھی افسانوں کے کرداروں میں (variety) کی قلت صاف محسوس ہوتی ہے۔ گھوم پھر کر جن کرداروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے وہ یا تو مظلوم ہوتے ہیں یا پھر ظالم۔ رشید بھٹی، جمال ابڑو، ایاز قادری، امر جلیل اور نسیم کھرل جیسے بڑے افسانے نگاروں کے ہاں ایسے کرداروں کی بہتات نظر آتی ہے۔ اردو کے مقابلے میں سندھی افسانہ نگاروں نے طوائف کے کردار کو بھی کم پیش کیا

ہے۔ دیہی زندگی کی عکاسی میں اردو افسانہ احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کی صورت میں پورے دبستان کی شکل رکھتا ہے۔ جبکہ سندھی میں غلام ربانی آگرو کے یہاں دیہات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

سندھی افسانے میں ہم جنسیت کو بھی موضوع کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں خیر النساء جعفری کا افسانہ ''حویلی سے ہاسٹل تک'' عصمت کے ''لحاف'' کی یاد دلاتا ہے۔ کسی وقوع یا واقعے کی نشاندہی کے لیے ایک سماجی حقیقت نگار کے لیے جس بے رحم سفاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خیر النساء جعفری کے لہجے میں بخوبی محسوس کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک جنسی موضوعات کی بات ہے سندھی افسانے میں اس سے متعلق کامیاب افسانے لکھے گئے ہیں۔ غلام نبی مغل نے جنسیاتی موضوعات پر بھرپور و بے باک انداز میں لکھا۔ نور الہدی شاہ نے وڈیرانہ ماحول میں جنسی و نفسیاتی نیز مرد کی عیاشیانہ رویوں اور مرد پرستی کے جذبے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ سماجی حقیقت نگاری میں سندھی افسانہ نگاروں کی مشاہداتی بصیرت کمال کی ہے۔ اظہار و بیانیے میں فن کارانہ چابکدستی نظر آتی ہے۔

اُردو افسانے کے مقابلے سندھی افسانے میں مزدوروں و محنت کشوں سے زیادہ (ہاریوں) کسانوں سے ہمدردی کا اظہار موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ میں صنعتی معاشرہ نہیں تھا زرعی معاشرہ تھا۔ اسلوبی سطح پر دونوں زبانوں نے ترقی پسند افسانے کے لیے سماجی حقیقت نگاری کے اسلوب کو اپنایا۔ تکنیک کی سطح پر اردو افسانہ وافر تجربات رکھتا ہے۔ سجاد ظہیر سے لے کر منٹو تک شعور کی رو، تلازمہ خیال، طنز، تجسس، فلیش بیک، سرئیلزم اور رمزیت وغیرہ کی تکنیک میں افسانے تحریر کیے۔ بحر حال اس سوچ سے قطع نظر کہ ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال، نشیب و فراز، کمزوریوں و حاصلات کی جمع تفریق کیا رہی، بحیثیت مجموعی اردو و سندھی افسانے کے باب میں اس رجحان کے تحت لازوال موضوعات کا اضافہ ہوا۔

حواشی:

(۱) قمر رئیس، ''ترقی پسند ادب کے معمار''، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۶۔

(۲) شمیمہ بیگم، ڈاکٹر، ''ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین''، (کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۲۵۶۔

(۳) مظہر جمیل، ''سید، جدید سندھی ادب''، (اکادمی بازیافت، مارچ ۲۰۰۷ء)، ص ۵۹۵۔

(۴) ایضاً۔

(۵) منظور علی ویسرو، ''ترقی پسند تحریک کے سندھی ادب پر اثرات''، (حیدر آباد: سندھی ادبی سنگت، سندھ، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۶۱۔

(۶) ایضاً، ص ۱۵۹۔

(۷) مظہر جمیل، سید، "جدید سندھی ادب"، (اکادمی بازیافت، مارچ ۲۰۰۷ء)، ص ۶۰۰۔
(۸) حیات اللہ انصاری، "بھرے بازار میں"، (لاہور: مکتبہ اردو، طبع اول)، ص ۲۱۵۔
(۹) محمد طارق چودھری، "پریم چند کے بہترین افسانے"، (چودھری اکیڈمی، اشاعت سوم، ستمبر ۲۰۰۸ء)، ص ۱۶۷۔
(۱۰) طاہر منصور فاروقی، "کرشن چندر کے بے مثال افسانے"، (لاہور: الحمد پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۵۳۔
(۱۱) طاہر منصور فاروقی، "بلونت سنگھ کے بے مثال افسانے"، (لاہور: الحمد پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۹۔
(۱۲) ممتاز شریں، "اردو افسانہ پر مغربی افسانے کا اثر"، مشمولہ "اردو افسانہ: روایت اور مسائل"، مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۱۹۸۴ء)، ص ۶۹۔
(۱۳) طاہر منصور فاروقی، "عصمت چغتائی کے بے مثال افسانے"، (لاہور: الحمد پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۱۔
(۱۴) مرزا حامد بیگ، "اردو افسانے کی روایت"، (کراچی: دوست پبلی کیشن، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۷۲۔
(۵) احمد ندیم قاسمی، "سناٹا"، (لاہور: اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۱ء)، ص ۱۶۱۔
(۱۶) وقار عظیم، "نیا افسانہ"، (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء)، ص ۲۷۸۔
(۱۷) سبط حسن، "مقالہ: وادی سندھ کا سوشلسٹ صوفی"، مشمولہ "نوید فکر"، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۷ء)، ص ؟؟؟؟؟؟
(۱۸) غفور میمن، ڈاکٹر، "سندھی ادب جو فکری پس منظر"، (کراچی: شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر، کراچی سٹی)، ؟ ص ۳۵۶۔
(۱۹) ایضاً۔ء)
(۲۰) منظور علی ویسرو، "ترقی پسند تحریک کے سندھی ادب پر اثرات"، (حیدر آباد: سندھی ادبی سنگت، سندھ، ۲۰۱۰ء)، ص
(۲۱) ایضاً، ص ۲۲۴۔
(۲۲) ایضاً، ص ۲۲۵۔
(۲۳) شیخ ایاز، "جمال ابڑو، کہانیوں، مضمون، شخصیت"، (کراچی: ثقافت آء سیاحت کھاتو، حکومت سندھ ۱۹۹۲ء)، ص ۱۔
(۲۴) بدر ابڑو، "جمال ابڑو"، (دھیکا، ۲۰۰۹ء)، ص ۴۴۔
(۲۵) علی بابا، "چند آء مانی"، (کنڈیارو: منجھون کھانیوں، روشنی پبلی کیشن، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۰
(۲۶) تاج بلوچ، "جدید ادب جو تجزیو"، (کراچی: سوجھرو پبلی کیشن، دسمبر ۲۰۱۴ء)، ص ۱۶۲۔
(۲۷) امر جلیل، "مرنے سے پہلے مرنے کے بعد"، (کنڈیارو: مھنجو ڈس آسمان کان پچھو، روشنی پبلی کیشن، ۲۰۰۰ء)، ص ۶۲

ماٰخذ:

۱۔ ابڑو، بدر، "جمال ابڑو"، (دھیکا، ۲۰۰۹ء)

۲۔ انصاری، حیات اللہ، "بھرے بازار میں"، (لاہور: مکتبہ اردو، طبع اول)

۳۔ ایاز، شیخ، "جمال ابڑو، کہانیوں، مضمون، شخصیت"، (کراچی: ثقافت آء سیاحت کھاتو، حکومت سندھ، ۱۹۹۲ء)

۴۔ بابا، علی، "چند آءمانی"، (کنڈیارو: منجھون کھانیوں، روشنی پبلی کیشن، ۱۹۹۴ء)

۵۔ بلوچ، تاج، "جدید ادب جو تجزیو"، (کراچی: سوجھرو پبلی کیشن، دسمبر ۲۰۱۴ء)

۶۔ بیگ، مرزا حامد، "اردو افسانے کی روایت"، (کراچی: دوست پبلی کیشن، ۲۰۱۴ء)

۷۔ بیگم، شمیم، ڈاکٹر، "ترقی پسند تنقید کا ارتقاء اور احتشام حسین"، (کراچی: اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)

۸۔ جلیل، امر، "مرنے سے پہلے مرنے کے بعد"، (کنڈیارو: مھنجو ڈس آسمان کان پچھو، روشنی پبلی کیشن، ۲۰۰۰ء)

۹۔ جمیل، مظہر، سید، "جدید سندھی ادب"، (اکادمی بازیافت، مارچ ۲۰۰۷ء)

۱۰۔ چودھری، محمد طارق، "پریم چند کے بہترین افسانے"، (چودھری اکیڈمی، اشاعت سوم، ستمبر ۲۰۰۸ء)

۱۱۔ رئیس، قمر، "ترقی پسند ادب کے معمار"، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۳ء)

۱۲۔ سبط حسن، "مقالہ: وادی سندھ کا سوشلسٹ صوفی"، مشمولہ "نوید فکر"، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۷ء)

۱۳۔ شیریں، ممتاز، "اردو افسانہ پر مغربی افسانے کا اثر"، مشمولہ "اردو افسانہ: روایت اور مسائل"، مرتبہ: پروفیسر گوپی چند نارنگ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشن، ۱۹۸۴ء)

۱۴۔ عظیم، وقار، "نیا افسانہ"، (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء)

۱۵۔ فاروقی، طاہر منصور، "بلونت سنگھ کے بے مثال افسانے"، (لاہور: الحمد پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء)

۱۶۔ قاسمی، احمد ندیم، "سناٹا"، (لاہور: اساطیر، اکتوبر ۱۹۹۱ء)

۱۷۔ میمن، غفور، ڈاکٹر، "سندھی ادب جو فکری پس منظر"، (کراچی: شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر، کراچی یونیورسٹی)

۱۸۔ ویسرو، منظور علی، "ترقی پسند تحریک کے سندھی ادب پر اثرات"، (حیدرآباد: سندھی ادبی سنگت، سندھ، ۲۰۱۰ء)